بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد دین و سیاست کی تفریق مسلم معاشرے پر جس رفتار سے اثر انداز ہوتی گئی، اسی رفتار سے ملت اہلِ دنیا اور اہلِ مذہب کے دو گونہ عناصر میں بٹتی گئی۔ لیکن جب تک مسلمانوں کی اپنی حکومتیں برقرار رہیں، یہ عناصر ایک دوسرے کے ساتھ لگے رہے۔ دورِ حاضر میں جب مغربی اقوام کی تاخت نے مسلم سلطنتوں کا خاتمہ کر کے اپنے امپیریلسٹ اقتدار قائم کیے تو اہلِ دنیا اور اہلِ مذہب دونوں بٹ کر نہ صرف الگ الگ ہو گئے، بلکہ دونوں کا ارتقاء بالکل متخالف سمتوں میں ہوا۔ ایک نے تمام مذہبی اصولوں کو قربان کر کے دنیوی فوائد کو سمیٹا، اور دوسرا عنصر مذہب کی بچی کھچی قدروں کو سینے سے لگا کر حجرہ نشین ہو گیا۔

ان دونوں کے درمیان جو خلیج موجود تھی وہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

لیکن اب جو مسلم ممالک غیر ملکی تسلط سے نکل کر آزادی کی سطح پر آ رہے ہیں، اُن کے لیے معاشرہ کا ان دو متخالف عناصر میں بٹا ہوا ہونا ایک انتہائی نازک اور فوری طور پر قابلِ حل مسئلہ ہے! آزادی پانے کے بعد ہر جگہ قدرتی طور پر معاشرہ کی تعمیرِ نو کا سوال اُبھر آیا ہے اور معاشرہ کو کسی بھی نئے نقشے پر تعمیر کرنے کا کام پوری قوم کے تعاون کے بغیر کبھی بخیر و خوبی سرانجام نہیں پا سکتا۔ یہی مسئلہ پاکستان کے سامنے بھی پوری اہمیت کے ساتھ ہے!

جماعت اسلامی برعظیم ہند و پاک میں وہ پہلی جماعت ہے جس نے تعمیر کا وقت آنے سے پہلے ہی معاشرے کے ان دونوں عناصر کو خالص اسلامی اصولوں پر جمع کرنے اور ان کے درمیان وسیع ہوتی ہوئی خلیج پر پل بنانے کی قابلِ ذکر خدمت انجام دی ہے۔ یہ جماعت چونکہ اول روز سے ایک اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کی تعمیر کا منصوبہ لے کے اٹھی تھی اور اسی کے لیے ملت کی فکری و عملی طاقتوں کو منظم کر رہی تھی اس لیے ناگزیر تھا

کرے معاشرے کے دونوں ہی طرح کے عناصر میں نفوذ کرے اور دونوں کو ایک صف میں جمع کر دے۔ خوش قسمتی سے اسے داعیِ اوّل ملا تو ایسا کہ جس نے دونوں طرف کے سرچشمہ ہائے علوم سے بھی استفادہ کیا تھا اور دونوں عناصر کو قریب سے سمجھا بھی تھا۔ چنانچہ وہ بالفاظِ خویش "بیچ کی راس کا ایک آدمی" تھا۔ پھر اس کی آواز پہ دونوں طرف سے جو لوگ آگے بڑھے ان کی کچھ تو فکری ساخت ایسی تھی اور کچھ ان کی تربیت اس طرح ہوتی گئی کہ ان کی مجموعی قوت قوم کے مذہبی اور جدید عنصر کو باہم قریب تر لانے کا ایک موثر ذریعہ بن گئی۔ جماعت اسلامی نے اسلام کی خالص اور بے آمیز دعوت کو پیش کرنے کے لیے ایک ایسی زبان، ایک ایسا طرزِ استدلال، ایک ایسی تکنیک اختیار کی جو اپنی روح کے اعتبار سے براہِ راست قرآن کے عین مطابق تھی اور دوسری طرف وہ جدید عنصر کے ذہن سے اقرب بھی تھی: اُس نے اپنی دعوت کے لیے خطابت، صحافت اور لٹریچر میں بالکل نئے راستے نکال لیے۔ اُس نے مذہبی عنصر اور جدید عنصر دونوں کو اپنے لیے یکساں مخاطب سمجھ کر جو آواز بلند کی، اس طرح بلند کی کہ وہ دونوں کے لیے قابلِ فہم اور مُؤثر ہو۔ اُس نے دونوں طرف کی اصطلاحات کو متقابلاً استعمال کر کے دونوں ہی طبقوں کے لیے ان کو قابلِ فہم بنا دیا۔ اُس نے ایک طرف دین کو تمام ٹکنیکل بحثوں سے الگ کر کے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے نتھار کر سامنے رکھ دیا اور دوسری طرف جدید ترین مسائل اور زمانے کے آخری تقاضوں کو زیرِ بحث لا کر یہ واضح کر دیا کہ یہ مسائل اور تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ اسلام کے اصول ان کا سامنا نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس کی دعوت نے دونوں طرف یکساں قلوب کو فتح کیا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے مقصدِ وجود کو پورا کرنے کے لیے جب اس جماعت نے مطالبۂ نظامِ اسلامی کا قدم اٹھایا تو یہ معاً برسرِاقتدار طاقت کی معتوب بن گئی۔ برسرِاقتدار طاقت چونکہ اس مطالبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر تیار نہ تھی اور نہ اس کی یہ توقعات پوری ہو سکیں کہ پروپیگنڈے کے زور سے یہ مطالبہ غبار بن کے ہوا میں اُڑ جائے گا، لہٰذا اُس نے محسوس کر لیا کہ ایک کشمکش کا چیلنج اس کے سامنے ہے۔ اس چیلنج کا رُو در رُو ہو کر جواب دینے کے لیے جب کوئی کامیاب تدابیر قابلِ عمل نہ معلوم ہوئیں تو ایک خاص سازش

اس مقصد کے لیے بنائی گئی کہ جدید طبقے کو جو موجودہ نظام تمدن کو چلا رہا ہے، دعوتِ اسلامی کی دسترس سے نکال لیا جائے اور اس کو ساتھ ہے کر آئندہ مراحل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت اختیار کی جاسکے۔

یہ کوشش مطلبیے کے ظہور کے ساتھ ہی ساتھ درپردہ شروع کر دی گئی۔ سرکاری عہدہ داروں اور مختلف محکموں کے افسروں کو نہ صرف جماعت کے خلاف ڈرانے سرکلر جاری کر کے متوحش کیا گیا بلکہ زبانی چرچا کیا گیا کہ یہ ایک خطرناک ملائی تحریک ہے جو دورِ جدید کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے چودہ سو سال پہلے کا تمدن بالجبر مسلط کر دینا چاہتی ہے۔ پھر آگے چل کر یہ مہم برسرِ عام بھی چلائی گئی۔ اور اس میں برسرِ اقتدار طبقے کے ساتھ کمیونسٹ ملاحدہ، منکرینِ حدیث اور مسلمانوں میں شمار ہونے والے ان تمام لوگوں نے اپنا اپنا حصۂ محنت شامل کر دیا جو اندر سے تبدیلِ دین کر چکے تھے۔

آج جبکہ دستوری جدوجہد پورا زور پکڑ چکی ہے، اچانک بڑی محنت سے لکھی ہوئی یا لکھوائی ہوئی ایک کتاب پبلک کے سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب بڑے اونچے اشاعتی معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور جدید طبقے خصوصاً سرکاری افسروں، ایڈیٹروں اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں میں بلاقیمت تقسیم کی جا رہی ہے۔ ایک صاحب کو تو خود ایک مرکزی وزیر صاحب نے بنفسِ نفیس اپنے دستِ مبارک سے ہدیۃً پیش کی ہے۔ اس کتاب کا منشا بجز اس کے کچھ نہیں کہ جماعت اسلامی کے خلاف، جہاں مختلف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا غبار اٹھایا جائے، وہاں اس پر ملائیت کا ٹھپہ لگا کر جدید عنصر کو تعصب میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبارات میں ایک ہی انداز کے لکھے ہوئے مضامین کا ایک ایسا طوفان اٹھ پڑا ہے جو دستور کے مسئلے میں عوام کو پریشان کرنے کے علاوہ علمائے دین کے خلاف جدید عنصر میں متعصبانہ نفرت پھیلانے والا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کوئی معشوق ہونا چاہیے۔ ہم اس معشوق کو پہلے سے جانتے تھے، مگر وہ اُس روز پوری طرح کھل کر عوام کے بھی سامنے آگیا جس روز ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے پشاور کے اسلامیہ کالج میں تقریر کرتے ہوئے پورے زعمِ اقتدار کے ساتھ فرمایا کہ ہم ملّا کو برسرِ اقتدار نہیں آنے دیں گے؎۱

؎۱ مگر سوال تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی اتھارٹی کیا ہے کہ اگر قوم کسی کو اپنی آراء سے آگے لانا چاہے تو آپ نہیں آنے دیجیے۔

یہ عظیم الشان مگر خطرناک مہم جو وزیروں اور بعض لیڈروں، ایڈیٹروں اور ادیبوں نے مل کر اب تک چلائی ہے، اگرچہ تحریک اسلامی کے نشوونما و ارتقاء کا راستہ روک نہیں سکی، تاہم اس نے جدید عنصر (خصوصیت سے اپر مڈل کلاس) پر اثر ضرور ڈالا ہے۔ وہ باتیں جو کسی حد تک تحریروں سے، اور بیشتر نجی گفتگوؤں کے ذریعے پھیلائی گئی ہیں، حسب ذیل ہیں :-

—— اسلامی دستور کا مطالبہ محض چند ملاؤں کا مطالبہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ موجودہ کارفرما جدید عنصر کو پیچھے ہٹا کر ملاؤں کو برسر اقتدار لایا جائے۔

—— جس اسلامی نظام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اس کے پیچھے مولویوں کی ایک پولیس اسٹیٹ کا تصور کام کر رہا ہے یعنی، لوگوں پر تازیانوں اور کوڑوں کے زور سے ایک نامرغوب تبدیلی مسلط کر دی جائیگی تبدیلی بھی کوئی معنوی اور ٹھوس اور مفید تبدیلی نہیں ہوگی بلکہ یہ کہ جبراً ڈاڑھیاں رکھوائی جائیں گی، جبّے اور عمامے لباس میں داخل کر دیئے جائیں گے، ازار زبردستی اونچے اٹھوا دیئے جائیں گے، مار دھاڑ کر کے نمازیں پڑھوائی جائیں گی، وغیرہ!

—— اسلامی نظام میں زندگی پر ہر پہلو سے بے پناہ جکڑبندیاں عائد کر دی جائیں گی۔

—— ملائی حکومت تمام تفریحات کا خاتمہ کر دے گی۔

—— جدید ذرائع و وسائل کو چھوڑ کر یہ لوگ پھر سے قدیم ذرائع و وسائل کی طرف لوٹ جائیں گے مثلاً جہاد کے لیے توپوں اور بموں کو ترک کر کے پھر سے تلواریں سونت لی جائیں گی اور موٹروں اور ہوائی جہازوں کو غیر اسلامی قرار دے کر اونٹوں اور گھوڑوں کا دور واپس لایا جائے گا۔[۱]

—— جدید مسائل سے قطع نظر کر کے صدیوں پرانی فقہ کو بلعینہٖ قانون نافذ کر دیا جائے گا۔

—— اندھا دھند سارے کا سارا موجودہ نظام چوپٹ کر کے رکھ دیا جائے گا۔

---

[۱] آپ حیران نہ ہوں کہ کیا فی الواقع ایسی یاوہ گوئی کے لیے کوئی بنیاد بھی کسی کو مل سکتی ہے۔ جی ہاں! ایک اچھے خاصے ترقی پسند ادیب نے نظامِ اسلامی کے خیالی نقشے پر اسی طرح کا رنگ بھر کے دکھایا ہے۔

اندازہ کیجیے کہ اس طرح کے پروپیگنڈے کے نتیجے میں اسلام جدید عنصر کے لیے جو اس سے براہ راست واقف نہیں ہے، کتنا خوفناک ہوّا بنایا جا رہا ہے۔ یہ ہوّا دکھا دکھا کر اور پھر اسلامی نظام کی آواز بلند کرنے والے ہر فرد اور گروہ پر "ملا" کی گالی پوری شانِ حقارت کے ساتھ چسپاں کر کر کے اس بیر تو اس خلیج کو کتنا وسیع کیا جا رہا ہے جسے پاٹنے کے لیے آج ہمہ جہتی محنت کی ضرورت ہے!

اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس پروپیگنڈے کا سخت مقابلہ کیا جائے اور قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کو جھوٹ اور فریب کے اس غبار سے باہر نکال کر اصل حقیقت کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت ہم اس صحبت میں اس طبقے سے براہ راست خطاب کرنا چاہتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ ایسا ہونا سرے سے ممکن نہیں ہے کہ کسی معاشرے کے ایک قلیل سے عنصر کی محض اپنی تمنائے اقتدار عوامی تحریک بن سکے۔ عوامی تحریک ہمیشہ کسی ایسے عوامی محرک کے بل پر کھڑی ہوتی ہے جو پورے معاشرہ کے ذہنی پس منظر میں ایک تاریخی عامل بن کر کام کر رہا ہو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملک کے پورے کے پورے عوام مطالبۂ نظام اسلامی کے ہمنوا بن کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور آج پشاور سے ڈھاکہ اور ڈھاکہ سے کراچی تک ایک ہی آواز ہے کہ جو لہریں لے رہی ہے۔ یہ تحریک ٹھیک پاکستان کی تحریک کی طرح ہمہ گیر بنتی جا رہی ہے، اور یہ تحریک پاکستان کی تحریک کا تتمہ ہے۔ خوب سمجھ لیجیے کہ یہ محض چند ملاؤں کے دھنکوں کا کرشمہ نہیں ہے اور نہ تاریخ انسانی میں اس طرح ہتھیلی پر سرسوں جمائی جا سکتی ہے۔ اس عوامی مطالبہ کی جڑیں بڑی گہری ہیں، اور بہتر ہوگا کہ آپ ان جڑوں کا گہرا جائزہ لیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمان بحیثیت ایک ملت کے ہمیشہ سے یہ ایک چبھتا ہوا احساس رکھتے ہیں کہ جو کچھ ان کو ہونا چاہیے، وہ اب وہ نہیں رہے ہیں، اسلام کے اصولوں پر ان کا معاشرہ استوار نہیں ہے اور ان کا نظامِ زندگی وہ نہیں ہے جس کا نقشہ قرآن نے پیش کیا تھا۔ مسلمان کہلاتے ہوئے اسلام سے منحرف ہو کر زندگی بسر کرنا ایک ایسا نمایاں اور زندگی گیر تضاد ہے کہ جس نے ہمیشہ اُن میں وہ بے چینی کی حس پیدا کی ہے جس سے تبدیلی کے ذوق کے سوتے پھوٹا کرتے ہیں۔

چنانچہ تاریخ امت میں بار بار اس حس نے ایسی قوتوں کو ابھارا ہے جنہوں نے غیر اسلامی معاشرتی ماحول اور اس کی پاسبانی کرنے والے اقتداروں سے ٹکر لی ہے۔ یہ حس بڑی تاریخی حس ہے۔ یہ ایک مستقل حس ہے اور اس کی آبیاری بڑے بڑے ائمہ وصلحا نے اپنی قربانیوں سے کی ہے۔ یہ اتنی گہری حس ہے کہ نہ پرچھوں کی ملوکیت اور جباری اس کا خاتمہ کرسکی اور نہ غیر ملکی طاقتوں کی قاہری وساحری اس کی جڑیں اکھیڑنے میں کامیاب ہوسکی۔ یہ حس وہ طاقتور حس ہے کہ جس نے برعظیم ہندوپاک کے مسلمانوں کی ہر تحریک میں اپنے ظہور کے لیے راستے نکالے ہیں۔ تحریک خلافت ہو یا جمعیت العلماء، مجلس احرار ہو یا تحریک خاکساراں، ہر ایک کے اندر یہ دل بن کے دھڑکی ہے۔ اور تو اور، خود تحریک پاکستان کی گرماگرمیاں اس تاریخی حس کی وجہ سے تھیں اور اسلامی نظام زندگی ہی کا بلاوا وہ بلاوا تھا جس نے جمود زدہ مسلمانوں کے خون کو گرم اور ارادوں کو جوان کر دیا اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر لاکھڑا کیا۔

پھر یہ تاریخی حس وہ بلا کی قوت ہے کہ جو ہمارے پورے لٹریچر کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اردو زبان میں گذشتہ دو صدیوں کے مسلم لٹریچر کی تعمیر میں جن جن کی خدمات کا حصہ ہے، وہ شعوری یا نیم شعوری طریق سے بہر حال ہماری اسی ملی حس کی تسکین وآبیاری کا سامان کرتے رہے ہیں۔

اس حس کو نہ کھرچ کر ملت کے ذہن سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کو نظر انداز کرکے کوئی قدم کامیابی سے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ بخلاف اس کے جو طاقت اور جو عنصر بھی اس حس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اٹھے گا، وہ جب بھی اٹھے رائے عام کو ساتھ لینے میں کامیاب ہوجائے گا۔ چنانچہ یہی آج ہو رہا ہے۔ تحریک نظام اسلامی چند ملاؤں کے وعظوں کا ظہور نہیں ہے، بلکہ وہ اس تاریخی قوت[1] (Historical force,) کا ظہور ہے۔ جو لوگ اس تاریخ کو ملاؤں کی تحریک سمجھ کر اسے مذاق

[1] یہ تاریخی قوت آج پاکستان ہی میں نہیں، قریب قریب سارے ہی اسلامی ممالک میں ابھر رہی ہے۔ شروع شروع میں مغربی تہذیب کی یورش نے اسے کسی قدر دبا لیا تھا، لیکن اب جبکہ اس تہذیب کی چمک دمک کے نیچے چھپے ہوئے مفاسد خوب نمایاں ہوگئے ہیں اور خود مغرب ہی کے علماء ومفکرین اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگے ہیں، مشرق کی آنکھوں سے بھی مرعوبیت کے پردے ہٹ رہے ہیں اور اب مسلمان ملکوں کی نوجوان طاقت اسلامی تحریک کی علمبردار بن کر میدان میں آرہی ہے۔

میں اڑانے کی، یا اسے بادِ ہوائی چیز سمجھ کر نظر انداز کرنے کی غلطی کریں گے، ان کو بہت ہی جلد اپنے جائزے کی کوتاہی کا اندازہ ہو جائے گا۔ پس ہم اپنے تعلیم یافتہ طبقے سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ حالات کا مطالعہ کرنے میں گہرے غور و فکر سے کام لیں، اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ کو غلط اندیش لوگوں کے حوالے نہ کریں۔ ورنہ اگر ایسا ہوا کہ ملک کی عوامی طاقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے، اس کی امنگوں کے خلاف آپ نے چند اقتدار یافتہ افراد کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو آپ کو ابھی سے سوچ لینا چاہیے کہ جمہوری نقطۂ نظر سے ایک اقلیت ہوتے ہوئے آپ کب تک رائے عام کو کچل کر زندگی کی راہ پر اقدام کر سکیں گے؟

اسلامی نظام کے قیام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس روز اس کی صبح نمودار ہوگی تو آج جو لوگ نظامِ تمدن و حکومت کو چلا رہے ہیں ان کو معاً برطرف کر کے ان کی جگہ تلاش کر کر کے ایسے اشخاص کو لا بٹھایا جائے گا جن کے چہروں پر ڈاڑھیاں ہوں اور جو جبہ و عمامہ سے آراستہ ہوں۔ کسی مسجد کے مولوی کو ڈپٹی کمشنر، کسی جامع کے خطیب کو گورنر، کسی عربی مدرسے کے مدرس کو ڈائرکٹر اور کسی دارالافتاء کے مفتی کو ہائی کورٹ کا جج بنا کے بٹھا دیا جائے گا۔

یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کے بنائے ہوئے ہوّے ہیں، براہِ کرم ان سے ڈر کر مضحکہ نہ بنیے! ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ تمدن و سیاست کا نظام آج جو ہاتھ چلا رہے ہیں ان کے تعاون کے بغیر مستقبل کا کوئی نظام بھی نہیں چل سکتا۔ آخر جن لوگوں نے اجتماعی نظام کی مشینری کو چلانے کی تربیت پائی ہے اور جنہوں نے کام کر کے اس کا تجربہ حاصل کیا ہے اُن کو پیچھے ہٹا کر کوئی بھی تحریک اناڑیوں کو بڑی بڑی ذمہ داریاں کیسے سونپ سکتی ہے۔ یہی دماغ اور یہی ہاتھ جو آج نظامِ زندگی کو چلا رہے ہیں، انہی کو کل بھی چلانا ہے۔ بجز ایسے ناکارہ عنصر کے جو اسلامی نظامِ زندگی کا کارکن بننے کے لیے فکر و عمل کے لحاظ سے اصلاح کی کوشش کے باوجود اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرنے پر تیار نہ ہو۔ اور آخر دم تک وہ اس کی مزاحمت کرتا چلا جائے۔

اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری موجودہ کارکن طاقت، ابھی سے اسلام کو سمجھنے اور اس کے مطابق

اپنے طرزِ عمل کو سازگار بنانے پر متوجہ ہو جائے۔

دنیا کا کوئی بھی نظام ایسا نہیں ہے جو مجرد قانون کے ڈنڈے کے بل پر چل سکتا ہو۔ قانون کسی معاشرہ کے بناؤ میں منفی پہلو سے حصہ دار ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مجرد منفی پہلو سے ایک نظام کے قیام و بقا کا اہتمام کرنے پر اکتفا کرنا ایک کھلی کھلی حماقت ہے۔ نظام اصلاً تعلیم و تربیت (یہ اصطلاح ہم وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں) کی مثبت تدبیر کے بل پر چلتے ہیں۔ تعلیم و تربیت سے مطلوبہ نقشے پر افراد تیار ہوتے ہیں، تعلیم و تربیت سے اجتماعی ذہن بنتا ہے اور تعلیم و تربیت ہی سے معاشرتی ماحول تیار ہوتا ہے۔ قانون کی منفی تدبیر کی ساری اہمیت یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کی مثبت مہم کے راستے سے رکاوٹیں دور کرے، وہ مواقعات کا ازالہ کرے، اور وہ اُن عناصر کے پنپنے کو روک دے جو تعلیم و تربیت کے سانچے میں کسی طرح ڈھل کر نہ دیں۔

ہمارے نزدیک قانونی جبر کو زندگی کے کسی گوشے میں استعمال کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مخالف قوتوں کو دلیل کے میدان میں شکست دے لی جائے، ورنہ تاریخ گواہ ہے کہ ان قوتوں نے کسی بہتر سے بہتر قانون کو کبھی نہیں چلنے دیا۔ کوئی نظام اپنے خلاف کام کرنے والی فکری و استدلالی قوتوں سے پوری طرح ہتھیار رکھوائے بغیر اگر محض قوت کے استعمال سے پنپنا چاہتا ہے تو قدم قدم پر اس کا راستہ وہ فکری و استدلالی قوتیں روکتی ہیں، یہاں تک کہ وہ اسے بالکل زچ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ قانون کی قوت دلیل کی قوت کو کبھی شکست نہیں دے سکتی۔ دلیل کی قوت کو دلیل ہی کی قوت توڑ سکتی ہے اور اس معرکے کے لیے تعلیم و تربیت کی مہم چلانا نفاذِ قانون کے مقابلے میں اولیت رکھتا ہے۔

کسی قسم کی بھی قانون سازی سے پہلے ہمارے نزدیک اس قانون کا احترام کرنے والی رائے عام کی تخلیق و تربیت کی ضرورت ہے۔ جوں جوں فضا تیار ہوتی جائے، قانون سازی کا قدم آگے آگے اُٹھتے جانا چاہیے۔ پہلے اکثریت کو کسی مقصد کے لیے ہم آہنگ کیا جانا چاہیے اور پھر اس مقصد کے تحفظ کے لیے قانونی تدابیر کو عمل میں لایا جانا چاہیے۔

مولویوں کی پولیس اسٹیٹ اور ملاؤں کی ڈکٹیٹر شپ چلانے کا الزام تحریک اسلامی پر عاید کرنے والوں کو چاہیے یہ تھا کہ وہ پہلے "نہ نکاتی مطالبے" ہی کا جائزہ لے کر دیکھتے کہ جس نظام میں پوری پوری شہری آزادیوں کا دستوری تحفظ پیش نظر ہے، جس میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا جا رہا ہے، جس میں انتظامیہ اور مقننہ کے اقدامات کو عدالت میں چیلنج کرنے کی گنجائش چھوڑنا پیش نظر ہے، اور جس میں اصول انتخاب کو بنیادی اہمیت دی جا رہی ہے، اس میں آخر کسی پولیس اسٹیٹ اور کسی ڈکٹیٹر شپ کے قیام کا راستہ کدھر سے کھلا رہ جاتا ہے؟ پھر ان حضرات کو چاہیے تھا کہ یہ تحریک اسلامی کو چلانے والی منظم طاقت کی داخلی تنظیم اور اس کی دستوری ہیئت کا جائزہ لیتے کہ جس جماعت میں تمام مناصب انتخابی ہیں، جس میں سارا کام جماعت کے مشورے سے عمل میں آتا ہے، جس میں ارکان اپنے امرا کو معزول کر سکتے ہیں، جس میں تنقید کی سو فیصدی آزادی افراد کو دی گئی ہے اور جس میں امیر اور شوریٰ کے اختلاف کی صورت میں فیصلہ کن طاقت پورے ارکان کو قرار دیا گیا ہے، کیا ایسی ہی تنظیموں کے ہاتھوں ڈکٹیٹر شپ اور پولیس اسٹیٹ قائم ہوا کرتی ہے؟

کیا ایسے اندھے اور جاہلانہ پروپیگنڈے سے ملک کے تعلیم یافتہ عنصر کو متاثر ہونا چاہیے؟

کہا جاتا ہے کہ چند سطحی تغیرات سے زیادہ اسلامی نظام کی اسکیم میں کوئی شے شامل نہیں ہے ہم پوچھتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے صوبۂ پنجاب اور صوبۂ سرحد کے انتخابات میں شرکت کرتے ہوئے جو منشور دیا تھا کیا اسے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح آج ٹریفک کنٹرول کے لیے چوکوں پر سپاہی کھڑے ہو کر ڈیوٹی انجام دیتے ہیں، کل اسی طرح محکمۂ احتساب کے کارندے سڑکوں پر کھڑے ہو کر ہر اس شخص کی پیٹھ پر تازیانے برسا دیں گے جس کے ڈاڑھی نہ ہو گی یا جو کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہو گا، اور ہر اس شخص کا چالان کر دیں گے جس کے لباس میں ایک عربی جبّہ اور حاجیوں کا رومال شامل نہ ہو گا، اور یہ قینچی لے کر ہر اس پاجامے اور شلوار کے پائینچے کاٹ ڈالیں گے جو ٹخنوں کو چھوئے؟

خدا کے انبیاء اصلاً جس کام کے لیے آتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے سوا کسی کی مرضی

اور کسی کے قانون کے سامنے جھکنے پر مجبور نہ ہوں، وہ معاشی حیثیت سے کسی کے ظلم کا شکار ہو کر اس فطری توازن کی برکات سے محروم نہ ہوں جو اللہ تعالیٰ کو زندگی میں مطلوب ہے، وہ اخلاقی لحاظ سے ان قدروں سے آراستہ ہوں جو ہمیشہ انسانیت کے ارتقا کا وسیلہ بنی ہیں اور ان کو فحشاء و منکر کے ان تمام حملوں سے محفوظ کیا جائے جو جوہرِ انسانیت کے لیے ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

باقی رہی وضع قطع اور آداب و اطوار، تو یہ ایک معاشرے میں فطری طور پر ان اصولوں، خیالات، مقاصد، اور جذبات کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھتے ہیں جو کسی معاشرے میں من حیث المجموع نافذ ہو جائیں۔ ان کے لیے قانون اور پولیس کی طاقت کو کبھی کسی نے استعمال نہیں کیا۔ انگریزی اقتدار نے بھی آداب و اطوار کو بغیر کسی جبر کے بدل دکھایا تھا اور اسلامی نظام بھی آئے گا تو نئے آداب و اطوار اس کے نتیجے کے طور پر خود بخود نشو و نما پائیں گے۔ اصل ہم زندگی کی بنیادی قدروں اور نظام زندگی کی اساسات کو بدلنے کی پیش نظر ہے، باقی چیزوں کو یہ تبدیلی خود بخود درست کر دے گی۔

پروپیگنڈے کا گھڑا ہوا یہ ہوّا بھی بہت خوفناک ہے کہ زندگی بے شمار جکڑ بندیوں میں مبتلا ہو جائے گی۔ حالانکہ اسلام میں "حلال" کا دائرہ بے حد و نہایت وسیع ہے اور "حرام" کا رقبہ نہایت محدود۔ ممنوعات کی فہرست بڑی مختصر ہے اور مباحات کا میدان کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ پابندیاں بالکل معمولی اور گنتی کی ہیں اور آزادی کی جولانگاہ دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کے معاملے میں گنتی کی چند چیزیں حرام کرنے کے بعد باقی میدان کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں کوئی مذہبی ڈریس اور حدودی مقرر نہیں ہے کہ لازماً ہر شخص اسے پہننے پر مجبور ہو بلکہ پابندی ہے تو صرف اتنی کہ لباس ساتر ہو، اسراف اور کبر کے مظاہرے سے پاک ہو اور کسی خاص گروہ کی نقالی اور بدنواری نہ رکھتا ہو۔ ان حدود کی پابندی کے بعد آپ آزاد ہیں کہ جس طرح کا کپڑا چاہیں استعمال کریں اور جس فیشن اور جس تراش کو چاہیں اپنے لیے پسند کریں۔

اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں اسلام نے تھوڑی سی حدود عائد کرنے کے بعد آدمی کو کھلی چھوٹ دے دی ہے کہ وہ زمانے ملک اور موسم کے تقاضوں اور اپنے ذوق کے مطالبوں کے مطابق جس طرح چاہے زندگی

بسر کرے۔ یہ ذراسی پابندی حدود درحقیقت اس کی وسیع آزادی کے تحفظ کے لیے ہے۔ کوئی اسلامی حکومت بے جا ضابطہ بندی (Codification) کی پالیسی اختیار کرکے، بغیر کسی اہم اجتماعی مصلحت کے افراد کی آزادیوں کو جکڑبند نہیں کرسکتی۔

پس یہ تو محض خیالی ہوّا ہے، کسی ہوشمند کے لیے اس سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں!

اسلامی نظام کے بارے میں یہ بھی ایک جھوٹا پروپیگنڈا ہے کہ وہ زندگی کو تفریح سے خالی کرکے رکھ دیگا۔ واقعتہً اسلام میں تفریحات پر کسی قدر قدغن ہے، مگر صرف ایسی تفریحات پر ہے جو اپنے نتائج کے اعتبار سے انسانی معاشرے کے لیے ہمیشہ مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ شراب کو ذریعۂ تفریح نہ بننے دیگا، لیکن کافی، چائے، شربت اور دوسرے پاکیزہ مشروبات پر اس نے کوئی قید عائد نہیں کی۔ وہ آپ کو نامحرم عورتوں سے تفریح حاصل کرنے سے روکے گا، لیکن آپ دائرہ نکاح میں جی بھر کے تفریح کرسکتے ہیں۔ وہ آپ کو قمار کے کھیلوں سے روکتا ہے، لیکن آپ دوسرے میدانی اور خانگی جو کھیل چاہیں کھیلیں، اسلامی احکام ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ وہ آپ کو اس سینما سے بھی محروم کردے گا جو آپ کو فحشاء و منکرات کا سبق دیتا ہے لیکن دوسری طرف اگر آپ اس سینما کو ایسی تفریح کا ذریعہ بنائیں جو تعلیم و تربیت کے تقاضے بھی پورے کرے تو وہ اس سے استفادہ کرنے میں آپ کے لیے مانع نہیں ہوگا۔ وہ بلاشبہ آپ کو مخلوط مجالس کی ناپاک تفریح کی آزادی نہیں دیتا لیکن جداگانہ مجالس تفریح کو اس نے کبھی حرام قرار نہیں دیا۔ وہ دوسروں پر استہزاء کرنے کی تفریح کو یقیناً کراہت سے دیکھتا ہے لیکن اس نے چہروں کو مسکراہٹوں سے محروم کرنے کے لیے کبھی کوئی اقدام نہیں کیا ہے، بلکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکراہٹ پیش کرنا بھی ایک صدقہ ہے۔ اسلام میں یقیناً آلاتِ موسیقی سے تفریح کو روکا گیا ہے، لیکن شادی بیاہ اور تقاریب پر پاکیزہ گیت گانے جانے سے، ترنم سے، شعر و شاعری سے، ادبی تخلیق سے، خطابتی کمالات سے اس نے انسانیت کو کبھی محروم کرنے کی سعی نہیں کی۔

تفریح انسانی زندگی کا ایک فطری تقاضا ہے اور اسلام نے اس کے لیے پوری طرح راستے کھولے

ہیں۔ پابندی اگر کوئی عاید کی ہے تو تفریح کی اُن چند صورتوں پر جو اخلاقی لحاظ سے کھلے کھلے مفاسد رکھتی ہیں۔

کوئی نظامِ ریاست، اس کے اصول چاہے کسی نوعیت کے ہوں، اپنے دور کے ذرائع و وسائل سے قطع نظر کر کے ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔ چنانچہ خود نبی صلعم کے دور میں جب اسلامی نظامِ ریاست قائم ہوا تو دوسری قوموں کے فنونِ جنگ اپنائے گئے، رومیوں سے صف بندی کا طریق اخذ کیا گیا، خندق بنانے کا ایرانی طریقہ اپنایا گیا، اور پھر قرونِ مابعد میں تو مقصد نے مسلمانوں میں قوتِ تخلیق و ایجاد کو اُبھار دیا اور وہ منجنیقوں اور دبابوں کی نئی نئی اقسام ایجاد کر کے زمانے کی بڑی بڑی قوموں کے فاتح بنے۔

آخر خدا نے اپنے انبیاء اور اپنی کتب کو اس مقصد کے لیے تو نہیں بھیجا ہے کہ ایک خاص ملک اور زمانے کے تمدن پر تاریخ کو روک کر ہمیشہ کے لیے کھڑا کر دیا جائے کہ بس یہاں تک تو جو ایجادات ہوتی رہی تھیں وہ "اسلامیائی" جاتی ہیں اور اس کے بعد جو ذرائع و وسائل ظہور پذیر ہونگے وہ سب غیر اسلامی قرار دیئے جاتے ہیں۔ بس اب ہمیشہ کے لیے لڑائی کا ہتھیار تیر کمان، تلوار اور نیزہ ہونگے اور سواری صرف گھوڑوں اور اونٹوں پر کی جائے گی۔

یاد رکھیے کہ فطرت کی ساری قوتیں، اور تمام کی تمام مادی ایجادات اصلاً بندگیٔ رب اور خدمتِ حق میں ممد ہونے کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ تو ان قوتوں اور ایجادات کی بدقسمتی ہے کہ یہ بری طاقتوں کے ہاتھوں میں آ کر بُرے مقاصد کی خادم بن گئی ہیں۔ اب اگر اسلام ایک طاقت بن کر نمودار ہوتا ہے تو سب سے بڑھ کر اسی کو حق پہنچتا ہے کہ ان کو اپنے پاکیزہ مقاصد میں استعمال کرے۔

اسلام اور کفر کی تفریق اصول و مقاصد میں ہوتی ہے، نہ کہ ذرائع و وسائل میں! ایک ہی ذرائع و وسائل کفر کے ہاتھوں میں جا کر اس کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور وہی اسلام کے ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے اسلحۂ جنگ بن جاتے ہیں! ان پر کسی کا اجارہ نہیں، بلکہ جو "بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"!

موجودہ ذرائع و وسائل تو کیا، اگر ایک اسلامی ریاست کو اس دور میں چلنا ہے تو تسخیر قوائے فطرت اور ایجادِ ذرائع و وسائل میں اسے دوسری قوموں سے اپنا قدم آگے بڑھانا ہو گا۔

پرانی فقہ اگرچہ ہمارے جلیل القدر محققین و مفکرین کی محنتوں کے قیمتی نتائج کا ایک بیش بہا خزانہ ہے اور ہم اپنی اس زریں میراث کو دریا برد کر کے اگر آگے بڑھیں گے تو ہم سے زیادہ احمق کوئی نہ ہوگا، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اپنی جگہ قابل لحاظ ہے کہ ہمارے قانون و فقہ کا علمی ارتقاء ایک مسلسل چلتے رہنے والے اسلامی نظام زندگی کے ساتھ ساتھ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اسلامی نظام کے سقوط کے بعد آہستہ آہستہ اس کا تعلق عملی زندگی کے مسائل سے کٹتا گیا ہے، یہاں تک کہ آخر کار صرف مسلمانوں کا پرسنل لا تھا جو عملاً باقی رہ گیا اور اسی دائرے سے متعلق فقہ کو پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا۔ لیکن خود اس دائرے میں بھی اجتہاد کی پیش قدمی رک گئی آج اگر ہم ایک اسلامی ریاست اور اسلامی نظام زندگی چلانے کا تہیہ کر کے اٹھیں تو ہمیں اس حقیقت کو مان کر آگے بڑھنا چاہیے کہ ہماری فقہ کا علمی ذخیرہ سیاست، معیشت، معاشرت اور تمدن کے ان جدید ترین مسائل کے چیلنج کا تیار بتیار جواب اپنے اندر نہیں رکھتا ہے جو اس کے اجتہادی ارتقاء کے رک جانے کے بعد آہستہ آہستہ نمودار ہو کر پہاڑ جیسے مسائل بن گئے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد کا ناخن تدبیر ضروری ہے اور آج قدیم فقہ کے علمی ذخیرے سے جو روشنی ہمیں مل سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کے ذریعے نت نئے مسائل کو حل کرنے اور اصولوں کو روزمرہ کے معاملات پر منطبق کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

جس دن عملاً ایک اسلامی نظام برپا ہوگا اس دن اجتہاد کا دروازہ از خود کھل جائے گا اور کوئی قفل اس پر لگا نہ رہ سکے گا۔ مسائل جب سامنے آئیں گے اور اپنا فوری حل طلب کریں گے تو اجتہاد کے کٹر سے کٹر مخالف بھی مجبور ہو جائیں گے کہ وہ نگاہ کو وسیع کریں اور فکر کو بیدار کریں۔

البتہ یہ واضح رہے کہ اجتہاد اسلام کے اصولوں کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، نہ کہ ان سے انحراف کرنے کے لیے۔ آج کل یہ اصطلاح چونکہ اس دوسرے معنی میں بھی بولی جاتی ہے اس لیے یہ صراحت ضروری معلوم ہوئی۔

اسلامی نظام کے طریق نفاذ کا یہ تصور بڑا ہی مضحکہ انگیز تصور ہے کہ ایک رات کو لوگ موجودہ نظام کے سائے میں سوئیں گے اور صبح اٹھیں گے تو کایا کلپ ہو چکی ہوگی۔ اسکولوں اور کالجوں میں نئے ماسٹر اور

پروفیسر جلوہ گر ہو جائیں گے، عدالتوں میں نئے جج اور وکلا ظہور کریں گے، اسمبلیوں میں نئے وزیر اور ایم این اے نمودار ہو جائیں گے، نصابِ تعلیم اور درسی کتب ایک ہی رات میں نئی چھپ کر تیار ہو جائیں گی، پرانے قوانین کو ایک آرڈر سے منسوخ کر کے یکایک نئے قوانین ان کی جگہ نافذ کر دیے جائیں گے، سودی بنکنگ سسٹم کو ایک فیصلے کے ذریعے توڑ دیا جائے گا، سابق ضابطۂ ملازمت بارہ گھنٹے کے اندر اندر منسوخ ہو کر نیا ضابطۂ ملازمت چل جائے گا، سکہ راتوں رات بدل دیا جائے گا —— اس طرح انقلاب کا ایک احمقانہ نقشہ بنا کر اسلامی نظام کے علمبرداروں پر چپکایا جاتا ہے اور پھر ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔

جی نہیں! —— جو لوگ نظامِ اسلامی کا مطالبہ لے کے اٹھے ہیں وہ اتنے کورے نہیں ہیں، انہوں نے ایک وسیع لٹریچر اپنے منصوبے کو واضح کرنے کے لیے مرتب کر کے میدان میں ڈال دیا ہے۔ آپ اگر اسے پڑھیں تو وہ آپ کو بتائے گا کہ اسلامی نظام کی علمبردار طاقت کوئی سر پھری طاقت نہیں ہے۔ اسے اندازہ ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کو بدلنے کے لیے، موجودہ نظم و نسق کو بدلنے کے لیے، موجودہ مالیات اور بنکنگ کو بدلنے کے لیے موجودہ زرعی نظام کو بدلنے کے لیے کتنی کاوشوں اور تیاریوں اور منصوبہ بند اقدامات کی ضرورت ہو گی۔ مثلاً صرف ایک نظامِ تعلیم کو بدلنے کے لیے جہاں ایک نئے نظریۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کو اختیار کرنا ہو گا اور جہاں نصاب کے نقشے بدلنے ہوں گے، وہاں اسے چلانے کے لیے نئے اساتذہ تیار کرنے ہوں گے، درسگاہوں میں نیا ماحول پیدا کرنا ہو گا اور تمام درجات کے لیے درسیات کی نئی تدوین کی ضرورت ہو گی اور پھر اس سروسامان کے ساتھ نئے تعلیمی تجربات عمل میں لانے ہوں گے اور ایک مدت میں ہمارا مطلوبہ نظامِ تعلیم تشکیل پذیر ہو گا۔ اسی طرح اگر ہم قانونی نظام کو بدلنا چاہیں گے تو ہمیں ماہرین کے ذریعے پورے قوانین اور عدلیہ کا جائزہ لینا ہو گا، پھر تبدیلی کا ایک منصوبہ بنا کر اس پر اس طرح اقدام کرنا ہو گا کہ ایک طرف فضا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پرانے قوانین منسوخ ہو کر نئے قوانین مدون ہوتے جائیں اور دوسری طرف ماہرینِ قانون کو نئے نقشے پر تیار کرنے کے لیے لاء کالجوں کا نظام بدلے۔ موجودہ لاء کالجوں اور موجودہ ججوں اور موجودہ ماہرینِ قانون کے ہاتھوں میں قرآن اور حدیث کی کتابیں دے کر یکدم تو آپ اسلامی قانون کو نافذ نہیں کر سکتے۔ آہستہ آہستہ اسی چلتے نظام کو نئے نظام میں منتقل کرنا ہو گا۔ یہی حال ہر دوسرے شعبے میں تغیر کو برپا کرنے کا ہے کہ اصولِ تدریج ایک فطری اصول

کی حیثیت سے از اول تا آخر کام کرے گا۔ اگرچہ تدریج کے معنی ٹال مٹول کے نہیں، جیسے کہ ایک گروہ عملاً آج اسی معنی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بعض مذہبی حضرات پورے کے پورے نظامِ شریعت کو یکبارگی نافذ کرنے کا نقشہ ذہن میں رکھتے ہیں اور پھر ایسے طریق سے اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی تحریک کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کو ان کی باتوں سے اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں ہی ہیں جن کو خاموشی سے سُن لینا چاہیے

بہرحال یہ حقیقت خوب اچھی طرح سمجھ لی جانی چاہیے کہ قوم کی اکثریت اور اس کی پوری عوامی طاقت اب اسلامی نظام سے ورے ورے کسی حالت پر مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اب اس کی تاریخی تمنائیں ایک منظم تحریک بن گئی ہیں اور اس تحریک کا راستہ دیر تک روکے رکھنا ایک اقلیت کے بس میں نہیں ہے ــــ اگرچہ وہ برسرِ اقتدار کیوں نہ ہو!

اب اگر ایک اسلامی نظام کو چلنا ہے تو وہ جب بھی چلے گا مذہبی عنصر اور جدید عنصر کے تعاون ہی سے چلے گا۔ جدید عنصر تمدن کی گاڑی کی ڈرائیونگ کا ماہر ہے مگر وہ اسلام کی شاہراہ کے پیچ و خم سے واقف نہیں ہے۔ دوسری طرف مذہبی عنصر ہے جو اسلام کی شاہراہ سے پوری طرح ماہرانہ واقفیت رکھتا ہے، لیکن اسے تمدن کی گاڑی کا ایک مدت سے تجربہ حاصل نہیں رہا! اب اگر ہم اپنے نظامِ زندگی کی گاڑی کو اسلام کی شاہراہ پر لے جانا چاہیں تو دونوں ہی عناصر کا تعاون اس کام کے لیے ضروری ہے۔ دونوں کو اپنے علم کو یکجا جمع کرنا ہوگا اور دونوں کو ایک متفق علیہ منصوبے پر عملی سرگرمیوں کا دارومدار رکھنا ہوگا۔

لیکن دونوں کے درمیان مطلوبہ تعاون بغیر اس کے رونما نہیں ہو سکتا ہے کہ باہمی بیگانگی اور تعصب اور نفرت و حقارت کے رویے کو ختم کیا جائے۔ اور یہ بغیر اس کے ختم نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف مذہبی عنصر کشادہ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرلے کہ نظامِ تمدن کو چلانے کی عملی مہارت جدید طبقے ہی کو حاصل ہے، اور دوسری طرف جدید طبقہ عالی ظرفی کے ساتھ اس واقعہ کو تسلیم کرلے کہ دین کے اصول و مقاصد اور احکام و قوانین کی ترجمانی کا حق مذہبی عنصر کو اس کے مقابلے میں بہرحال نمایاں طور پر حاصل ہے (باقی ص ۲۱۵ پر)